اشرف التفاسیر میں تعیینِ معنی اور عربی لغت سے استدلال

حافظ محمد شہباز حسن*

اشرف التفاسیر مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ خطبات، ملفوظات اور تقریباً جملہ تصانیف سے منتخب سیکڑوں تفسیری نکات کا مجموعہ ہے۔ جو مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی راہنمائی میں صوفی محمد اقبال قریشی اور ابو حذیفہ محمد اسحاق ملتانی نے مرتب کیا ہے۔ اس تفسیر میں عربی لغت سے استدلال کے بعض اسالیب بھی ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر القرآن میں عربی لغت سے استدلال کا صحیح منہج کیا ہے۔

قرآن مجید کا نزول چونکہ عربی زبان میں ہوا ہے۔ اس لیے تمام زمانوں میں مفسرین قرآن کی تفسیر میں عربی لغت سے استدلال کرتے رہے ہیں بالخصوص مشکلات القرآن اور نادر الاستعمال الفاظ کی تشریح وتوضیح میں انہوں نے اپنی اپنی تفاسیر میں عربی لغت سے استدلال کیا تاکہ فہم قرآن وتفسیر میں قاری کو کوئی دقت محسوس نہ ہو۔ آیات قرآن کی تشریح وتوضیح میں عربی لغت سے استدلال کا رجحان عہد صحابہ میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو نہ صرف کثرت سے اشعار جاہلی یاد تھے بلکہ وہ ان سے قرآنی الفاظ کی توضیح میں حسب موقع استدلال بھی کرتے تھے۔ جاحظ کی رائے ہے:

"كان عمر بن الخطاب أعلم الناس بالشعر" (۱)

"عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سب لوگوں سے بڑھ کر شعر کا علم رکھتے تھے۔"

ابن رشیق نے انہیں اپنے دور کا سب سے بڑا نقاد قرار دیا ہے۔ (۲)

عرب کے مشہور شعراء کا کلام انہیں کثرت سے یاد تھا۔ (۳)

الفاظ قرآنی کی شعر جاہلی سے توضیح کے لیے آپ مجالس میں لوگوں سے مذاکرہ بھی کرتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر آپ نے فرمایا:

"يأيها الناس عليكم بديوانكم شعر الجاهلية فإن فيه تفسير كتابكم" (۴)

"لوگو! اپنے دیوان شعر جاہلی کو لازم پکڑو۔ اس میں تمہاری کتاب (قرآن مجید) کی تفسیر موجود ہے۔"

اس فرمان سے مراد ظاہر ہے یہی ہے کہ شعر جاہلیت سے مختلف الفاظ کے معانی کی تعیین اور ان کا استعمال معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر قرآن میں عربی لغت سے استدلال کے سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔ وہ خود بیان کرتے ہیں:

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور، پاکستان

حواشي وحوالہ جات

۱۔ تفتازانی، سعد الدین، شرح التلویح علی التوضیح، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۶ء، ۲۴۲/۱۔
۲۔ صالح، محمد ادیب، تفسیر النصوص، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع سوم، ۱۹۸۴ء، ۴۶۷/۱، ۴۶۸۔
۳۔ سرخسی، محمد بن احمد، اصول، دار المعارف النعمانیہ، طبع اول، ۱۹۸۱ء، ۲۴۹/۱۔
۴۔ بزدوی، علی بن محمد، کنز الوصول الی معرفۃ الاصول، کراچی، امیر محمد کتب خانہ، س۔ن، ص ۱۱۔
۵۔ بخاری، عبد العزیز بن احمد، کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، طبع اول، ۱۹۹۷ء، ۱۰۶/۱۔
۶۔ ایضاً
۷۔ ملا جیون، شیخ احمد، شرح الانوار، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، طبع اول، ۱۹۸۶ء، ۳۷۴/۱، ۳۷۵۔
۸۔ سرخسی، اصول، ۲۴۹/۱۔
۹۔ صالح، محمد ادیب، تفسیر النصوص، ۴۷۱/۱۔
۱۰۔ النساء: ۴: ۳۔
۱۱۔ البقرہ: ۲: ۲۷۵۔
۱۲۔ بخاری، عبد العزیز بن احمد، کشف الاسرار، ۱۰۷/۱۔

''وہ فاطر السموات میں فاطر کا معنی نہ جانتے تھے تا آنکہ دو بدو اپنے کنویں کا جھگڑا لے کر ان کے پاس آئے تو ان میں سے ایک بولا: أنا فطرتھا (میں نے کنواں سب سے پہلے کھودا ہے) تو فاطر کا معنی ان کی سمجھ میں آ گیا۔''(۵)

مشکلات القرآن اور غریب القرآن کے فہم کے لیے جاہلی شاعری کی طرف رجوع کو ابن عباس رضی اللہ عنہما ضروری سمجھتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

'' الشعر دیوان العرب فإذا خفی علینا الحرف من القرآن الذی أنزله الله بلغة العرب رجعنا إلی دیوانها فالتمسنا معرفة ذالک منه .'' (۶)

''شعر عرب کا دیوان ہے جب قرآن، جس کو اللہ تعالیٰ نے لغت عرب میں نازل کیا ہے، کی کوئی بات ہم پر مخفی ہوتی ہے تو ہم عرب کے دیوان کی طرف رجوع کرتے ہیں جس سے ہمیں اس کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔''

مفردات قرآن اور آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح میں کلام عرب سے استفادہ و استشہاد عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد بھی جاری رہا۔ ابو بکر ابن الانباری فرماتے ہیں:

'' قد جاء عن الصحابة والتابعین کثیر الاحتجاج علی غریب القرآن و مشکله بالشعر(۷)

''صحابہ اور تابعین کا غریب القرآن اور مشکلات القرآن میں شعر سے استشہاد و احتجاج بکثرت ثابت ہے۔''

قرآن مجید کی اکثر تفاسیر میں عربی لغت سے حسنِ استدلال موجود ہے۔ اس بنیاد پر مفسرین کرام نے بہت سے اسرار و رموز اور نکاتِ عجیبہ و ثمینہ بیان کئے ہیں جو یقیناً عربی لغت اور قرآن مجید میں گہرے غور و غوض کا ثمرہ ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری نکات بہت مشہور ہوئے ہیں۔ بیان القرآن میں بہت سے مقامات پر لغت سے استدلال کیا گیا ہے۔

مولانا تھانوی نے بعض مقامات پر عربی لغت کی معرفت کو تفسیر قرآن میں ضروری قرار دیا ہے بلکہ کئی جگہوں پر اس سلسلے میں کئی علمی نکات بھی بیان کیے ہیں آپ قرآنی الفاظ کو جدید اصطلاحات پر محمول نہ کرنے کے قائل ہیں۔ قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت پر سمجھنے کی ضرورت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لوگ غضب کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو اصطلاحات فنون حاصل کرنے کے بعد پڑھتے ہیں، پھر ان اصطلاحات کو قرآن مجید پر جاری کرتے ہیں جس سے اشکال پڑتا ہے اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا قرآن کریم کو اصطلاحات فنون کا اتباع کس دلیل سے لازم ہے۔ قرآن کو ہمیشہ مذاق

عربیت اور محاورات پر سمجھنا چاہیے اصطلاحات علوم پر منطبق نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ سب اصطلاحات نزولِ قرآن کے بعد مدون ہوئی ہیں۔(۸)

اگر مدلولِ قرآن کا لحاظ رکھا جائے تو مولانا تھانوی محاورات کے استعمال کی اجازت بھی دیتے ہیں۔اگر مدلولِ قرآن کا لحاظ نہ رکھا جائے تو آپ محاورات میں قرآن کی ترجمانی کو درست قرار نہیں دیتے۔مثلاً بعض لوگوں نے ش ﴿ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ﴾ (۱۲:۱۷) میں استباق کا ترجمہ کبڈی کھیلنا کیا ہے۔اس کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

''یہ ترجمہ لغت کے بھی خلاف ہے......لغت میں استباق کے معنی آپس میں اس طرح دوڑنے کے ہیں کہ جس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنا مقصود ہو۔''(۹)

مولانا تھانوی نے جن اصول تفسیر کو مدنظر رکھا ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ آپ نے مفسرین کے مختلف اقوال کی صورت میں روایت اور ذوق عربیت کے جو زیادہ قریب نظر آیا صرف اسے نقل کر دیا جہاں دونوں برابر برابر تھیں وہاں دونوں نقل کر دیں۔(۱۰)

قرآن سے لفظ کے معنی و مفہوم کا تعین:

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتب میں بعض مقامات پر الفاظ کے معانی کا تعین قرآن مجید سے کیا ہے،تفسیر بیان القرآن اور دیگر کتب میں بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔مولانا تھانوی صاحب کی تقریباً جملہ کتب سے اشرف التفاسیر کے نام سے تمام تفسیری نکات جمع کیے گئے ہیں۔اس تفسیر کی روشنی میں قرآن مجید سے معنی کے تعین کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔﴿اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًا﴾[۱۱] میں اہل بیت کے بارے میں مفسر موصوف لکھتے ہیں:

اصل مدعا کے لیے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد ﷺ میں ازواج اولاً داخل ہیں۔دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے۔حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جبکہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہ کو اس بشارت پر تعجب ہوا،ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے:

﴿قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِيۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ اِنَّهٗ حَمِيۡدٌ مَّجِيۡدٌ﴾(۱۲)

''انہوں نے کہا: کیا تم اللہ کی قدرت سے تعجب کرتی ہو؟ اہلِ بیت! تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں،وہ بہت تعریف کیا گیا اور بزرگی والا ہے۔''

جب باقی انبیاء ورسل علیہم السلام کی ازواج مطہرات کو اھل البیت کہا گیا ہے تو آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کیوں اہل بیت نہیں ہیں؟

۲۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ﴾ (۱۳)

''تو جب یہ گواہ نہیں لا سکے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔''

اس آیت میں اگر عِندَ اللّٰهِ سے مرادفی علم الله ہوتو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ علم الٰہی خلاف واقع ہے۔یعنی اس صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ جس نے بدکاری ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھی محض گواہ نہ پیش کر سکنے سے وہ حقیقتاً کاذب قرار پاتا ہے اور گواہی کی عدم موجودگی کی وجہ سے بدکاری کا وقوع بھی نہیں ہوا ہوتا۔یہ ایک اشکال تھا جس کا جواب مفسر ممدوح نے محاورۂ قرآنی سے دیا ہے۔لکھتے ہیں:

''قرآن میں محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے صرف لفظی ترجمے اور لغت پر نہ رہنا چاہیے ایک لفظ کے لغوی معنی ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے مخاطب کو کوئی بات قابل شرح صدر حاصل نہیں ہوتی اور اسی کے ساتھ محاورہ کی رعایت کردی جائے تو بالکل اطمینان ہوجاتا ہے اور سننے والا پھڑک اٹھتا ہے اور بہت سے اشکال رفع ہوجاتے ہیں۔وہ جواب سنئے وہ یہ ہے کہ عِندَ اللّٰهِ کے معنی یہاں فی علم اللہ کے نہیں ہیں بلکہ فی قانون اللہ کے اور فی دین اللہ کے ہیں۔مطلب یہ ہوا کہ قانون شرعی اس صورت میں کہ شہادت نہ پہنچ سکی تہمت لگانے والوں کے لیے یہ ہے کہ ان پر حکم کذب کا کیا جائے گا یعنی ان کے ساتھ کاذب کا سا معاملہ کیا جائے گا چاہے واقع میں کچھ بھی ہو۔'' (۱۴)

﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (العلق ۲:۹۶)''اس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا'' کی تفسیر میں بعض لوگ علق کے لفظ سے جدید تحقیقات کی روشنی میں ثابت کرتے ہیں کہ منی میں کیڑے ہوتے ہیں۔علق چونکہ عربی زبان میں جونک کو کہتے ہیں۔جونک اور کیڑا ایک ہی بات ہے۔جس کی تردید مفسر تھانوی نے قرآن مجید سے علق کا معنی متعین کرتے ہوئے کی ہے،فرماتے ہیں:

''دین میں ایسی جرأت ہوئی ہے لوگوں کو کہ ہر شخص دخل دینے کو تیار ہے۔لغت تک کے علم کی ضرورت نہیں رہی۔ہر کیڑا تو جونک نہیں اور منی میں جونک نہیں اور مجاز کی کوئی دلیل نہیں پھر القران یفسر بعضه بعضا اور دوسری آیات میں فرمایا ہے:﴿مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ﴾ جس سے صاف واضح ہوا کہ علق ایسی کوئی چیز ہے جو نطفہ و مضغہ کے درمیان میں ہے تو وہ خون بستہ ہے اور وہ نطفہ کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ نطفہ کے بعد اور مضغہ کے قبل پس علق کے معنی لغت عرب میں خون بستہ کے ہیں۔کیا قرآن سے عقیدت اور محبت ہے کہ اس میں وہ چیزیں داخل کی جاتی ہیں جن کو اس کی زبان بھی شامل نہیں اور ان خرافات کو حمایت دین کہا جاتا ہے۔'' (۱۵)

﴿وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ ۲:۱۷۳) کی تفسیر میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہی جانور حرام ہے جس پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔ وہ جانور جو تقرب الی غیر اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اس کو حلال سمجھتے ہیں۔ مفسر مرحوم قرآن مجید سے ہی ان کی غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ ان کی غلطی ہے اور اگر ان کی تفسیر کو مان لیا جاوے اور ﴿وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ (اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) میں داخل نہ مانا جاوے تب بھی وہ ﴿ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ (المائدۃ ۵ : ۳) (جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے) میں داخل ہونا تو قطعی ہے اس لیے کہ وہ عام ہے ہر منوی لغیر اللہ (جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے تقرب کی نیت کی گئی ہو) کو، گو مذبوح باسم اللہ (اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو) ہی ہو، اس لیے سب ایک ہی حکم میں داخل ہیں۔'' (۱۶)

اس بحث میں ﴿وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں عند الذبح کی شرط کا وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ سے ازالہ کر دیا گیا ہے۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (النساء ۴:۳۴) ''مرد عورتوں پر سردار ہیں'' کی تفسیر کے بارے میں مفسر تھانوی فرماتے ہیں:

''آج کل اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں کے مزدور ہیں۔ سبحان اللہ، کیا تفسیر دانی ہے۔ ان مفسر صاحب سے کوئی پوچھے کہ ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ﴾ (اللہ تعالیٰ نے بعض کو فضیلت دی) کے کیا معنی ہیں؟ اگر جرأت کر کے یہ کہیں کہ اس میں بھی بَعْضَهُمْ سے مراد عورتیں ہی ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے مسلّم لیکن آگے جو فرماتے ہیں:

﴿وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ (اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں) اس میں تو ضمیر یقیناً رجال ہی کی طرف ہے کیونکہ منفق وہی ہیں تو کیا پھر فَضَّلَ اللّٰهُ کی وہ تفسیر سراسر مہمل اور تحریف قرآن نہ ہوگی۔ اگر یہ معنی ہوتے تو للنساء فرماتے، عَلٰی جو کہ تسلط کے لیے ہے نہ فرماتے۔''

اس بحث کا خلاصہ تحریر کرتے ہوئے مفسر فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر خلقۃً بھی فضیلت ہے چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ (۴۳:۱۸) مشرکین جو ملائکہ کو بنات اللہ کہتے تھے ان کا رد اس طرح فرماتے ہیں کیا تم ایسی مخلوق کی حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہو جو کہ پست

خیال ہے اور ہمیشہ بناؤ سنگھار اور زیور میں نشو ونما پاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ ان میں مقابلہ کے وقت قوت بیانیہ نہیں ہے۔ واقعی یہ دو صفتیں جو عورتوں کی ارشاد فرمائی ہیں کھلم کھلا نظر آتی ہیں۔"(۱۷)

قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ﴿وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ﴾(۱۸) "اور اس نے تختیاں ڈال دیں" اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مغلوب الغضب تھے کہ تختیاں پھینک دیں۔ صحیح صورت حال کیا تھی؟ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کی ایک آیت کریمہ پیش کر کے اس اشکال کا ازالہ کیا ہے۔ آیت کریمہ یہ ہے: ﴿اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾(۱۹)

"یہ کہ موسیٰ کو ایک صندوق میں رکھو پھر اس کو دریا میں ڈال دو پھر دریا اس کو کنارے تک لے آوے گا۔"

لکھتے ہیں: "القاء اور قذف کے معنی ایک ہی ہیں۔ فَاقْذِفِيْهِ میں قذف کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو پھینک دیا بلکہ معنی یہ ہے کہ جلدی سے دریا میں رکھ دیا۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے الواح کو جلدی سے رکھ دیا۔"(۲۰)

قرآن مجید میں القی کا لفظ پھینکنے کے معنی میں نہیں بلکہ ڈالنے کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾ (۲۱)

"اور اس نے زمین پر بڑے بڑے پہاڑ ڈال دیے تا کہ وہ تم کو نہ لے گرے۔"

اسی طرح مثلاً یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾(۲۲)

"میں نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی۔"

حدیث وسنت سے معنی و مفہوم کا تعین:

اشرف التفاسیر میں بعض مقامات وہ ہیں جن کی تفسیر و توضیح احادیث مبارکہ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ الفاظ کے معانی کا تعین حدیث وسنت سے کیا گیا ہے۔ حدیث مبارکہ مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک حجت مستقلہ ہے۔ ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾(۲۳) کے تکرار میں ایک لطیف اشارے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر چند کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے من وجہ استقلال ظاہری کا حکم رکھتی ہے پس اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جیسے قرآن مجید حجت مستقلہ ہے اسی طرح حدیث شریف بھی حجت مستقلہ ہے اور میں قرآن مجید کے ساتھ حدیث شریف کی

برابری کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں۔ لیکن اس اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ جیسے قرآن مجید کے احکام کو ماننا ضروری ہے اسی طرح احادیث سے جو احکام ثابت ہیں ان پر بھی ایمان وایقان واجب ہے، کسی کو کہنا جائز نہیں کہ جو مسئلہ قرآن شریف میں نہیں ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قرآن شریف میں نہیں احادیث سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔'' (۲۴)

آگے چل کر اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بلکہ حضور ﷺ کا فرمایا ہوا بھی مثل قرآن ہی کے حجت قطعیہ ہے۔ بہر حال نفس حجیت میں سب احادیث مشترک ہیں پس بڑی حسرت ہے ان لوگوں پر جو احادیث کو حجت نہیں مانتے وہ بڑے نور سے محروم ہیں۔ اس کا عجیب نور ہے حتیٰ کہ اس میں اور عامہ بشر کے کلام میں کھلا فرق ہے۔ عام کلام کے سامنے تو احادیث مثل کلام اللہ کے معلوم ہوتی ہے ہاں کلام اللہ کے مقابلے میں جب رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی بندے کا کلام ہے۔'' (۲۵)

اَضۡعَافًا كَثِيۡرَةً کا حقیقی مفہوم حدیث کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب آیت ﴿مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ (۲:۲۶۱) (جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کیے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانے کی حالت جس سے سات بالیں جمیں اور ہر بالی کے اندر سو دانہ ہوں) نازل ہوئی جس میں سات سو تک تضاعف کا ذکر ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رب زدنی۔ ہمیں اس سے بھی زیادہ دیجئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضۡعَافًا كَثِيۡرَةً﴾ (۲:۲۴۵) (اور کون شخص ہے کہ اللہ کو دے قرض کے طور پر قرض دینا، اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت حصے کو دیوے) معلوم ہوا اس آیت میں سات سو سے زائد تضاعف کا ذکر ہے اس بناء پر کم از کم سات سو سے دوگنا تو ہوگا اضعاف کی جمعیت اور اس کے اتصاف بالکثرت پر نظر کی جاوے تو پھر کچھ حد نہیں رہتی۔'' (۲۶)

ایک اور حدیث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اور ایک حدیث سے تو صریح معلوم ہوتا ہے کہ تضاعف فوق المتعارف ہے وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے راستہ میں ایک چھوارہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے یمین میں لے کر اس کو پروان فرماتے ہیں یہاں تک کہ وہ جبل احد سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے تو اب خیال کیجئے

جبل احد میں اگر تمر کے مساوی حصے فرض کئے جاویں تو کتنے اجزاء نکل سکتے ہیں ان کا کیا عدد ہوگا پھر اگر وہ حصے تمر کے مساوی حصے فرض کیے جائیں تو اور زیادہ عدد بڑھ جاوے گا پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ احد سے بھی زیادہ ہوگا تو معلوم ہوا کہ تضاعف کی کوئی حد نہیں بلکہ لا الی النهاية ہے۔''(۲۷)

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی سات ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾(۲۸)

''اللہ ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور ویسی ہی زمینیں۔''

حدیثِ تعددِ ارض میں بعض لوگوں نے ارض کا ترجمہ ''اقلیم'' کیا ہے صرف اس وجہ سے کہ انہیں کوئی اور زمین کہیں نظر نہیں آئی۔ مولانا لکھتے ہیں:

''جب قرآن شریف میں بعد سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کے مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ فرمایا ہے تو اقلیم ترجمہ کرنے کی گنجائش کہاں ہے؟ اور حدیث میں صاف آ گیا ہے کہ آسمان سات ہیں اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے۔ پانچ سو برس سے مراد کثرت ہے۔ اس کے بعد زمین کے متعلق بھی فرمایا: اب اقلیم کی تاویل کیسے چل سکتی ہے؟''(۲۹)

سیاق وسباق سے معنی ومفہوم کا تعین:

اشرف التفاسیر میں چند مقامات ایسے ہیں جہاں سیاق وسباق سے معنی ومفہوم کے تعین کی صراحت کی گئی ہے۔ اس صراحت کے بغیر معانی ومفاہیم کی تعیین تو سینکڑوں آیات کی تفسیر میں کی گئی ہے۔ بعض آیات قرآنیہ میں بادی النظر میں جو تعارض یا اشکال پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ کثیر المعانی اور اضداد الفاظ کا مفہوم سیاق وسباق کی روشنی میں نہیں لیا جاتا۔

۱۔ ایک مثال پیش کر کے مولانا اشرف علی تھانوی سیاق وسباق کو ملحوظ خاطر رکھنے کی اہمیت وضرورت بیان کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (۹۱:۹) (جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا) فرمایا ہے جس سے تزکیہ کا مدار فلاح اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۵۳:۳۲) (تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو) اس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ لا تزکوا نہی کا صیغہ ہے مشتق تزکیہ سے، تو اب اس کو اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزکیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہی ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگر اس آیت میں لَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن کریم میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد

ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کرلیا جائے گا تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہوجایا کرے۔''

مذکورہ بالا ہدایات میں جو شبہ بظاہر پیدا ہوا تھا، اس کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں:

''چنانچہ لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ پر جو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا سے تعارض کا شبہ ہوا تھا اس کا جواب اسی جملے کے ساتھ ساتھ دوسرے جملے میں مذکور ہے یعنی ﴿هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ کیونکہ اس میں نہی مذکور کی علت کا ذکر ہے۔''(۳۰)

مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو متقی کہنے کی ضرورت نہیں، اگر کوئی ایسا ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی شرعاً اجازت نہیں۔

۲۔ ﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (۳۱) میں منافقین کے انجام کی خبر دی گئی ہے کہ وہ روزِ قیامت پچھتائیں اور روئیں گے کیونکہ ان کی حرکتیں اسی قسم کی تھیں اور یہ انہی کے اعمال کا بدلہ ہوگا جو انہیں ملے گا۔ مفسر موصوف لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں نے ﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا﴾ (۸۲:۹) سے یہ سمجھا ہے کہ شریعت میں ہنسنے کی ممانعت ہے، یہ استدلال غلط ہے کیونکہ یہاں ضحک و بکاء دنیا مراد نہیں بلکہ فی الآخرۃ مقدر ہے اور فَلْيَضْحَكُوْا امر بمعنی خبر ہے کہ آخرت میں یہ لوگ زیادہ روئیں گے جیسے ہمارے محاورہ میں بولا کرتے ہیں اب سر پکڑ کر روؤ یعنی اب روؤ گے۔ یہ بھی خبر ہے امر بمعنی طلب نہیں اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد ﴿جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ مذکور ہے جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں وہ ضحک قلیل و بکاء کثیر مراد ہے جو ان کے اعمال پر بطور جزاء کے مرتب ہوگا ضحک و بکاء دنیوی مراد نہیں۔''(۳۲)

امر بمعنی خبر ہونے کا سبب بیان کرتے ہوئے مولانا موصوف لکھتے ہیں:

''یہاں معنی امر مراد نہیں بلکہ امر بمعنے خبر ہے جس میں کفار کی سزا اور عذاب کا ذکر ہے جس کی دلیل سیاق و سباق ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے کہ (تم گرمی میں مت نکلو کہہ جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے) (۸۱:۹) اور اس کے بعد ارشاد ہے (پس چاہیے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) (۸۲:۹) جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ بکاء سزا ہے اور ظاہر ہے کہ سزا وہ چیز ہوسکتی ہے جو سزا پانے والے کے اختیار میں نہ ہو بلکہ سزا دینے والے کے اختیار میں ہو اگر یہاں معنی انشاء مراد ہوں گے تو ضحک و بکاء مخاطب کے اختیار میں ہوگا اور وہ جزاء نہیں ہوسکتا پس ثابت ہوگیا کہ یہاں معنی انشاء

مراد نہیں بلکہ خبر دینا مقصود ہے کہ ان مشرکین کی سزا یہ ہے کہ وہ تھوڑے دنوں میں ہنس کھیل لیں اور اس کے بعد زیادہ روئیں گے اپنے اعمال کی سزا میں۔'' (۳۳)

مولانا فرماتے ہیں: مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذراسی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا نہ ماقبل کی خبر ہے نہ مابعد کی۔ (۳۴)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے آیت کا حقیقی مفہوم سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے آیت کو سیاق وسباق کی روشنی میں نہیں سمجھا لہٰذا آیت کے مدلول سے دور ہٹ گئے۔

۳. ﴿وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ (۳۵)

''اور اللہ کافروں کو مومنوں کے مقابلہ میں ہرگز غالب نہ کریں گے۔''

اس آیت میں مدلول کو اگر سیاق وسباق کی روشنی میں متعین کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو جو غلبہ عطا ہو گا اس کا تعلق آخرت سے ہے۔ دنیا میں بھی حقیقی مومنین کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ غزوات النبی (ﷺ) اور عہد خلفاء راشدین کو اگر مدنظر رکھا جائے تو یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے لیکن کہیں یہ مشاہدہ ہو کہ کفار اہل ایمان پر غالب ہو گئے ہیں تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ آیت بنیادی طور پر اخروی غلبہ سے متعلق ہے۔ مولانا تھانوی کفار کے دنیوی غلبہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اگر قرآن کے ساتھ ذوق ومناسبت ہو تو وہ ضرور یہ سمجھے گا کہ کلام اللہ غیر مرتبط نہیں ہے پھر جب اس کو مرتبط سمجھے گا تو ہر مقام پر سیاق وسباق کو بھی دیکھے گا چنانچہ اس آیت پر اشکال اس لیے ہوا کہ لوگوں نے ﴿لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ کے سباق کو نہ دیکھا۔ اس میں یہ حکم آخرت کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہے: ﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (۴:۱۴۱) حق تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے یعنی قیامت میں کفار ومسلمان کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا کون ناحق پر، اس کے بعد فرماتے ہیں: ﴿لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ اور اللہ تعالیٰ کفار کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے یعنی اس فیصلہ میں جو آخرت میں ہو گا اب کوئی اشکال نہ رہا۔'' (۳۶)

۴. ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۳۷)

''اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔'' میں حق تعالیٰ جل شانہ کا قرب حقیقی مراد نہیں بلکہ قرب علمی مراد ہے کیونکہ اس کے سباق میں فرمایا گیا: ﴿وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾ (۵۰:۱۶) ''اور اس کے جی میں جو خیالات

آتے ہیں، ہم ان کو جانتے ہیں۔''

موصوف مفسر اللہ تعالیٰ کے علم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب وہ وساوس قلب اور ارادہ وعزم اور افعال واقوال کو جانتا ہے تو اجزاء مستحیلہ متفرقہ کو جو جواہر واعیان ہیں کیونکہ نہ جانے گا) یہ تو سباق کی دلالت تھی اس استدلال پر آگے سیاق تو بہت ہی صریح ہے فرماتے ہیں: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ کہ ہم اعتبار علم کے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں (رگ سے مراد یہاں وہ رگ ہے جس کا اتصال شرط حیٰوۃ ہے اور حیٰوۃ کا مدار نفس وروح ہے مقصود یہ ہے کہ ہم انسان کے نفس وروح سے بھی زیادہ اس کے احوال کو جانتے ہیں کیونکہ ہمارا علم قدیم ہے اور حضوری اور انسان کے نفس وروح کا علم حادث ہے خواہ حضوری ہو یا حصولی اور حصولی تو فی نفسہ بھی ناقص ہے۱۲) علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں اقربیت سے اقربیت بالعلم مراد ہے۔'' (۳۸)

مفسر موصوف نے سیاق وسباق کو ملحوظ خاطر رکھنے کو بطور قاعدہ کے بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

''یہ قاعدہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھو کہ کسی آیت کی تفسیر محض اس آیت کے الفاظ کو دیکھ کر نہ کرو بلکہ سیاق وسباق کو ملا کر تفسیر کیا کرو بغیر اس کے تفسیر معتبر نہیں۔'' (۳۹)

سیاق وسباق سے معنی کی تعیین کی اور بھی کئی مثالیں اشرف التفاسیر میں موجود ہیں۔ (۴۰)

قرآنی الفاظ کا نزولِ قرآن کے وقت کا متداول بین العرب معنی ومفہوم مراد لینا:

اشرف التفاسیر میں اس سلسلے کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ مولانا تھانوی قرآن مجید کو اسی زبان میں اور اسی کے محاورہ کے مطابق سمجھنا ضروری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترجمہ دیکھنے والے ایک لفظ کا ترجمہ اپنے محاورہ کے موافق کر کے قرآن کریم پر اشکال کرنے لگتے ہیں۔ قرآن کریم عربی کلام ہے اور اس کی بلاغت وفصاحت اور اس کے معانی ومطالب کو وہی شخص جان سکتا ہے۔ جو عربیت کا پورا ماہر ہو اور عربی زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ قرآن کریم کو اسی زبان میں سمجھتا ہو جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہو۔'' (۴۱)

قرآن کو ہمیشہ عربی ذوق کے مطابق سمجھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لوگ غضب کرتے ہیں۔ قرآن مجید کو اصطلاحات فنون حاصل کرنے کے بعد پڑھتے ہیں پھر ان اصطلاحات کو قرآن پر جاری کرتے ہیں جس سے اشکال پڑتا ہے اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا قرآن کریم کو اصطلاحات فنون کا اتباع کس دلیل سے لازم ہے۔ قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت اور

محاورات پر سمجھنا چاہیے، اصطلاحات فنون پر منطبق نہ کرنا چاہیے۔'' (۴۲)

لفظ شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''الشیخ فی قومه النبی فی امته (شیخ اپنی قوم میں ایسے ہے جیسا نبی اپنی امت میں) اس سے مراد شیخ طریقت نہیں بلکہ بوڑھا آدمی مراد ہے کیونکہ یہ مقولہ حدیث کہا جاتا ہے اور اس زمانہ میں شیخ کا لفظ شیخ طریقت کے معنی میں قطعاً استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ حرف بالکل مستحدث ہے۔'' (۴۳)

﴿یَسۡئَلُهُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ (۴۴) ''اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرتے ہیں آسمان وزمین والے'' آیت میں من کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عاقل اور غیر عاقل مخلوق سب کے لیے استعمال ہوتا ہے البتہ یہ اکثر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس استعمال کی روشنی میں مفسر موصوف نے ایک نکتہ بیان کیا ہے لکھتے ہیں:

''ہاں اگر یہ کہا جائے کہ لغت سب پر حاکم ہے محققین پر بھی اور غیر محققین پر بھی کیونکہ قرآن کا نزول لغت پر ہوا ہے نہ کہ محققین کی تحقیقات پر اور لغت میں لفظ من ان ذوی العقول کے لیے خاص ہے جو ظاہر میں ذوی العقول ہیں تو بے شک تغلیب کا ماننا ضروری ہوگا اور یہی صحیح ہے لیکن اب یہ سوال ہوگا کہ پھر تغلیب میں نکتہ کیا ہے۔ سو اس میں نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے کہ اس میں ذوی العقول کو تنبیہ ہے کہ خدا سے مانگنا اصل میں ذوی العقول کا کام ہے اور جو تمہارا کام تھا اس میں غیر ذوی العقول بھی تمہارے شریک ہیں پھر تمہارا خدا سے سوال نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟'' (۴۵)

لیلۃ القدر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ﴾ (۴۶) ''شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔'' قدیم عربی زبان میں الف (ہزار) سے بڑا کوئی عدد نہیں ملتا۔ الف سے بڑا عدد بیان کرنا مقصود ہوتا تو عرب الف سے ہی بیان کرتے۔ الف الف یا الف الف مائة الف وغیرہ جیسے انداز سے بیان کرتے۔ مفسر تھانوی کے نزدیک مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اَلۡفِ شَهۡر سے کوئی خاص عدد مراد نہیں، لکھتے ہیں:

''﴿لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ﴾ میں مراد الف کا عدد معین نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ لیلۃ القدر افضل اور بہتر ہے جمیع ازمنہ سے، گو ان ازمنہ کی مقدار کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو یہ معنی اس لیے مراد لیا گیا ہے کہ عرب کے لوگوں میں حساب کی کمی کی وجہ سے الف سے زائد مقدار کے لیے کوئی لغت مفرد موضوع نہیں۔ پس حاصل یہ ہے کہ زائد سے زائد مدت جو تم تصور کر سکتے ہو لیلۃ القدر اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ اب یہ شبہ کہ بجائے شَهۡر سال کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا یہ جواب ہے کہ کفار عرب کے ہاں چونکہ سال نسیء کی وجہ سے کم وبیش ہوتا رہتا تھا۔ منضبط نہ تھا اور شَهۡر کا اہتمام وانضباط وہ کرتے تھے اس لیے شَهۡر کو اختیار فرمایا۔ باقی سال ان کے ہاں ٹھیک نہ تھا۔ کبھی تیرہ مہینے کا بنا دیا۔

کبھی گیارہ کا کبھی پورا کبھی کسی مہینہ کو سال میں آگے کر دیا کبھی پیچھے۔''(۴۷)

اس قسم کی اور بھی کئی مثالیں اشرف التفاسیر میں مل جاتی ہیں۔(۴۸)

حقیقی و مجازی معنی کے فرق کو ملحوظ رکھنا:

دیگر مفسرین کی طرح مولانا اشرف علی تھانوی کا یہی موقف ہے کہ حقیقی معنی متعذر ہو تو مجازی معنی مراد لیا جائے۔ بصورت دیگر حقیقت کو بلاوجہ مجاز بنانا درست نہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جنت کا ابھی سے پیدا ہونا عبث ہے اور اللہ تعالیٰ فعل عبث سے پاک ہے۔ موصوف مفسر لکھتے ہیں:

''مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی ﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ (۳:۱۳۳) (تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے) رد کر رہی ہے کیونکہ صیغہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں لینا مجاز ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہو اور بلاوجہ معنی مجازی لینا جائز نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں۔

حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالیٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنا رہے ہیں کہ ﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ (جنت متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے) اور اگر پیدا نہ ہوتی تو بجائے اس کے یہ فرماتے (یعنی جنت متقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعۃ میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شے موجود کی طرف راغب ہے اور اس وقت شیء معدوم کی طرف رغبت ہوتی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آ گئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔''(۴۹)

۲۔ جہاں پر حقیقی معنی مراد نہیں لیا جا سکتا وہاں پر موصوف مفسر نے بھی مجازی معنی ہی مراد لیا ہے۔ مثلاً زوجین کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (۵۰)

''عورتیں تمہارے لیے لباس اور تم ان کے لیے لباس ہو۔''

یہاں تشبیہ باللباس کی روشنی میں موصوف نے بہت سے نکات اور حکمتیں بیان کی ہیں۔ یہاں انہوں نے لباس کا حقیقی معنی مراد نہیں لیا۔(۵۱)

۳۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نزول مائدہ کے بارے میں دعا ﴿اللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اَنۡزِلۡ عَلَیۡنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوۡنُ لَنَا عِیۡدًا﴾ (۵۲) سے بعض لوگوں نے ''جشن عید میلا دالنبی ﷺ'' کے ثبوت کے لیے استدلال کیا ہے۔مفسر مرحوم نے شرع من قبلنا پر بحث کرنے کے بعد اس استدلال کا ابطال کرتے ہوئے لکھا:

''اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنادیں۔اس لیے کہ تکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے۔پس اس سے یوم نزول المائدہ لینا مجاز ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا پس معنی یہ ہیں تکون المائدۃ سرورا لنا یعنی وہ مائدہ ہمارے لیے سرور کا باعث ہوجاوے۔عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلا د النبی ﷺ ہی مراد ہو۔جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م ت ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں۔'' (۵۳)

۴۔ایک موقع پر انہوں نے تعذر حقیقت کی بنیاد پر انزال کو مجاز قرار دیا ہے﴿وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ﴾ (۵۴) غرض حقیقی معنے انزال کے اوپر سے آنے کے ہیں۔(۵۵)

مشہور وظاہر معنی کو ترجیح:

مولانا تھانوی نے بہت سے مقامات پر ظاہر اور مشہور معنی لینے کی صراحت کی نیز ظاہر ومشہور معنی سے انہوں نے بہت سے تفسیری نکات بھی بیان کیے ہیں۔البتہ بعض مقامات پر ظاہری اور مشہور معنی ترک بھی کیا ہے۔جہاں انہوں نے ظاہر اور مشہور معنی ترک کیا ہے وہاں اس کا سبب بھی بیان کیا ہے۔روزِ حشر کی درازی کے بارے میں ارشادالٰہی ہے:

﴿وَ اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ﴾ (۵۶)

''تیرے پروردگار کے ہاں ایک ایک دن تمہاری گنتی سے ہزار ہزار سال کے برابر ہے۔''

دوسری جگہ ہے:﴿فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ﴾ (۵۷)

''(وہ عذاب اس دن ہوگا) جس کی مدت پچاس ہزار سال ہے۔''

اسی طرح کی اور آیات ذکر کرنے کے بعد موصوف مفسر لکھتے ہیں:

''اگر کوئی دلیل معارض نہ ہوتی تو یہ آیت ظاہراً مقدار واقعی پر دال ہوتی مگر جب دوسری آیت معارض ہے تو ظاہر کو ترک کر کے خلاف ظاہر پر محمول کرنا واجب ہوگا جب کہ اس حمل سے کوئی امر مانع بھی نہیں رہا، یہ کہ سب نصوص میں ایسا ہی شبہ خیالی ہونے کا ہوجاوے گا سو ظاہر کو بدوں دلیل چھوڑنا جائز نہیں

یہاں دلیل ہے اور نصوص میں دلیل نہیں فشتان ما بینھا۔ ایسے ہی ظاہر کو دلیل سے چھوڑنے کی اور بھی نظائر ہیں کقولہ تعالیٰ قصۃ ذی القرنین ﴿وَجَدَھَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَھَا قَوْمًا﴾ (۸۶:۱۸) وجدان کا مادہ دو جگہ آیا ہے مگر اول وجد کو خیال پر محمول کیا جاتا ہے دوسرے کو واقعہ پر اول سے دوسرے میں شبہ واقعی نہیں ہوتا اور یہاں تک ضابطہ کا جواب ہو گیا۔'' (۵۸)

﴿وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا﴾ (۵۹) کی تفسیر میں مفسر مرحوم نے لفظ دعا پر بحث کی ہے کہ یہ پکارنے میں اور عبادت کرنے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہری معنی پکارنا ہے۔ لکھتے ہیں:

''قرآن میں دعا کے معنی عبادت کے بھی آئے ہیں چنانچہ بعض نے ﴿ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ (۶۰:۴۰) میں عبادت کے معانی لیے ہیں اور بعض نے دعا کو اپنے معنی میں رکھ کر لفظ عبادت کو جو ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ﴾ (۶۰:۴۰) میں ہے دعا کے معنوں میں لیا ہے نیز دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَدْعُو مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ﴾ (۵:۴۶) یہاں دعا بمعنی عبادت ہے غرض دعا دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اگر عبادت کے معنی لیے جائیں تب تو خلاصہ یہ ہوگا کہ اول بھی عبادت کا حکم ہے اور بعد میں بھی۔'' (۶۰) آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اگر دعا کے معنی عبادت کے لیے نہ لیے جائیں بلکہ اپنے ظاہری معنی پر رکھا جائے تو اس وقت بظاہر یہ آیت اس دعویٰ کے اثبات کے لیے مفید نہ ہوگی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس صورت میں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ عبادات دو قسم کی ہیں ایک تو وہ عبادت جس سے مقصود دین ہی ہے اور ایک وہ عبادت جس سے کبھی دنیا بھی مقصود ہوتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی عبادت اپنے عبادت ہونے میں زیادہ قوی ہے۔ اب سمجھئے کہ دعا عبادت کی ایسی فرد ہے کہ اس سے دنیا کی بھی طلب ہو سکتی ہے تو اس اعتبار سے دعا دوسرے درجے کی عبادت ہوگی۔'' (۶۱)

لفظ کا شرعی معنی و مفہوم:

قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں ہوا۔ مفسر تھانوی لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں میں یہ مرض ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کو قرآن میں ٹھونستے ہیں یہ بڑی جہالت ہے۔'' (۶۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

مشکل یہ ہے کہ لوگ قرآن کو اصطلاحات منطقیہ پر اتارتے ہیں محاورہ کو نہیں دیکھتے۔ (۶۳)

دیگر اصطلاحات کی بجائے شرعی اصطلاحات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

تفسیر عقلی اور عربی لغت سے استدلال:

بعض اوقات عربی لغت سے متعین ہونے والے معانی میں کسی عقلی اشکال کی بنا پر ترجیح دے دی جاتی ہے، ظاہری اور راجح معنیٰ سے عدول کیا جاتا ہے۔ مولانا تھانوی فہم قرآن کے لیے علوم عقلیہ کے حصول کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مگر عقل کو وحی الٰہی کے تابع رکھنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جو چیز ماورائے عقل ہو اس کو نقلِ صحیح کی وجہ سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ کفار کے ابدی جہنمی ہونے کے بارے میں ایک اشکال کا عقلی جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عقلاً انسان ادائے حق خداوندی سے عاجز ہے تو اب جو کچھ بھی اسے ملے وہ محض قدردانی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا ہوگا جو بعض رحم دل لوگوں کے دلوں میں آیا کرتا ہے کہ کافروں کے لیے ہمیشہ کے لیے خلود فی النار کیوں مقرر ہوا، کفر تو اس نے کیا تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم! یہ تو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالیٰ کے ساتھ جب شرک وکفر کیا تو اس نے حق تعالیٰ شانہ کے حقوق غیر متناہیہ کو ضائع کیا اور حقوق غیر متناہیہ ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہیہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ پس عمل متناہی کے بدلے جزا غیر متناہی جو مومنین کو عطا ہوگی۔ یہ البتہ عقل سے آگے ہے، عقل یوں کہتی ہے کہ جب عمل متناہی ہے تو جزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔ لوگ آج کل عقل عقل گاتے پھرتے ہیں مگر یہ عقل ان کی خیر خواہ نہیں دشمن ہے۔'' (۶۴)

قرآن کی بعض تعلیمات کو مشاہدہ کے خلاف قرار دینے والوں کا آپ ابطال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذوالقرنین کے قصہ میں آفتاب کا کیچڑ اور دلدل میں غروب ہوتا ہوا پایا جانا مشاہدہ کے خلاف قرار دیا جاتا ہے یہ بات بھی پیش کی جاتی ہے کہ سورج زمین سے کئی گنا بڑا ہے وہ دلدل میں کیسے ڈوب سکتا ہے۔ مولانا تھانوی جواب میں لکھتے ہیں:

> ''اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آئے گا یعنی قرآن میں وَجَدَ ☆......الخ وارد ہوا ہے یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ یہاں یہ نہیں فرماتا: غربت فی (کیچڑ میں ڈوب گیا) جہاز پر سوار ہو کر دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے وراسی میں ڈوب رہا ہے، اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع وغروب کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا اور زمین ہی میں گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا؟ اب فرمایئے مشاہدہ سے کہاں تعارض ہے۔ کہیں بھی نہیں۔'' (۶۵)

اللہ تعالیٰ کے علمی قرب کی عقلی دلیل پیش کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (٦٦)'' کے معنی کہ علماً ومعرفۃ بندہ سے ہم قریب ہیں بدلیل ﴿وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾ ☆ اسی وجہ سے نَحْنُ اَقْرَبُ فرمایا کہ ہم قریب ہیں۔انتم اقرب الینا نہیں فرمایا۔کہ تم ہم سے قریب ہو۔سو اگر اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا کیونکہ یہ قرب ونسبت متکررہ سے ہے۔اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری طرف سے بھی ضرور ہوگا، رہا قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو تو دوسری طرف سے بھی ہو تو قربِ علمی خدا کی طرف سے تو ہے اس لیے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں۔کیونکہ بندہ ہے غافل پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب،غرض حق تعالیٰ کو پوری معرفت ہے۔''(٦٧)

﴿ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ﴾ (یوسف۱۲: ۱۷) میں استباق کا ترجمہ بعض لوگوں نے کبڈی کھیلنا کیا ہے۔مولانا تھانوی اس ترجمہ کو لغت اور عقل کے خلاف قرار دیتے ہیں۔عقل کے خلاف ہونے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور عقلاً بھی ترجمہ غلط ہے اس لیے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دور نہیں جایا کرتے جس سے محافظ بچے کی نسبت بھیڑیئے کے کھا جانے کا احتمال ہو۔اگر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اس پر ضرور جرح فرماتے۔''(٦٨)

خلاصہ بحث:

تفسیر القرآن میں عربی سے استدلال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔تمام ادوار میں مفسرین نے عربی لغت سے استدلال کیا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ لغت سے استدلال کے صحیح منہج کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے قرآنی الفاظ کے معانی کا تعین کیا جائے،اور اس سلسلے میں آیات یا الفاظ قرآنی کے معانی میں جہاں جہاں تسامحات کا ارتکاب ہوا ہے ان کی نشاندہی کی جائے۔

اشرف التفاسیر کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید کو ذوقِ عربیت اور عربی محاورات کے مطابق سمجھنا چاہیے،اس پر جدید علوم کی اصطلاحات کا انطباق نہیں کرنا چاہیے۔

اگر کسی لفظ کا معنیٰ ومفہوم قرآن سے متعین ہوتا ہو تو اسے قرآن سے کرنا چاہیے۔

مولانا تھانوی کے نزدیک حدیث حجتِ مستقلہ اور قطعیہ ہے، جو لوگ اسے حجت نہیں مانتے وہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ بڑے نور سے محروم ہیں۔مولانا تھانوی کئی مقامات پر احادیث سے الفاظِ قرآنی کے معانی کی قرآنِ مجید سے تعین کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید کلامِ مرتبط ہے۔سیاق وسباق کو مدِنظر رکھ کر الفاظِ قرآنی کی تفسیر کرنی چاہیے۔

الفاظِ قرآنی کے وہ معانی جو نزولِ قرآن کے وقت متداول بین العرب تھے وہی اختیار کیے جانے چاہئیں، کیونکہ وہی قائل کی منشا کے مطابق ہیں۔

اسی طرح مولانا تھانوی کا موقف ہے کہ حقیقی معنیٰ متعذر ہو تو پھر مجازی معنیٰ مراد لیا جانا چاہیے، ورنہ مجازی معنیٰ مراد لینا درست نہیں۔ لفظ کے غیر ظاہر معنی پر حقیقی معنی کو فوقیت ہوتی ہے۔

مولانا تھانوی کا موقف ہے کہ قرآنِ مجید کو شرعی اصطلاحات کے مطابق سمجھنا چاہیے۔ اصطلاحاتِ فنون کا فہمِ قرآن کے لیے استعمال درست نہیں۔ لفظ کا شرعی معنیٰ مقدم ہونا چاہیے۔

عقل اور مشاہدہ کی بنا پر جن لوگوں نے قرآن کی لغوی تفسیر کے قواعد سے انحراف کیا ہے ان کی منہجی غلطی کی نشاندہی مولانا تھانوی نے کی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عمرو بن بحر الجاحظ، کتاب البیان و التبیین ۱/۱۶۳، ۱۹۶۸ء، دار الفکر للجمیع، بیروت

۲۔ ابن رشیق: کتاب العمدۃ ۱/۹۵، دار المعرفۃ، بیروت

۳۔ ایضاً ۱/۲۰۹

۴۔ محمد بن احمد بن فرخ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۱۰/۱۱۱، ط: ۱۳۶۷ھ، دار الکاتب العربی، قاہرہ

۵۔ جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القران ۱/۱۱۳، مکتبۃ العلم، اردو بازار، لاہور

۶۔ ایضاً ۱/۱۱۹

۷۔ ایضاً

۸۔ اشرف التفاسیر ۱/۷۶، ط: ۱۴۲۵ھ، ادارہ تالیفات اشرفیہ، چوک فوارہ، ملتان

۹۔ ایضاً ۱/۳۳

۱۰۔ مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن: مقدمہ، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی

۱۱۔ ۳۳/الاحزاب: ۳۳

۱۲۔ اشرف التفاسیر ۳/۲۲۴

۱۳۔ النور ۲۴: ۱۳

۱۴۔ اشرف التفاسیر ۳/۹۸

۱۵۔ ایضاً ۴/۳۲۵

۱۶ ایضاً ۱/۱۳۵

۱۷۔ ایضاً ۲/۲۲۔۲۳

۱۸۔ الاعراف ۷: ۱۵۰

۱۹۔ طٰہٰ ۲۰: ۳۹

۲۰۔ اشرف التفاسیر ۳/۴۷

۲۱۔ لقمان ۳۱: ۱۰

۲۲۔ النساء ۴: ۱۷۱

۲۳۔ النساء ۴: ۵۹

۲۴۔ اشرف التفاسیر ۲/۲۷

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً ۱/۲۱۳

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ الطلاق ۶۵: ۱۲

۲۹۔ اشرف التفاسیر ۱/۴۶۔۴۷

۳۰۔ ایضاً ۱/۳۹۔۴۰

۳۱۔ التوبہ ۹: ۸۲

۳۲۔ اشرف التفاسیر ۲/۲۲۷

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ایضاً ۲/۲۲۸

۳۵۔ النساء ۴: ۱۴۱

۳۶۔ اشرف التفاسیر ۲/۶۸

۳۷۔ ق: ۵۰: ۱۶

۳۸۔ اشرف التفاسیر ۴/۶۲۔۶۳

۳۹۔ ایضاً ۴/۶۷

۴۰۔ دیکھیے ایضاً ۱/۵۲، ۵۳، ۱۵۶، ۳/۲۴، ۱۶۵، ۳۳۱۔۳۳۲، ۴/۶۹

۴۱۔ اشرف التفاسیر ۱/۳۲

۴۲۔ ایضاً ۱/۷۶

۴۳۔ ایضاً ۲/۱۰۳

۴۴۔ الرحمٰن۵۵:۲۹
۴۵۔ اشرف التفاسیر۴/۱۱۶
۴۶۔ القدر۹۷:۳
۴۷۔ اشرف التفاسیر۴/۳۲۹
۴۸۔ دیکھیے ایضاً ۱/۴۵،۲/۱۱۴،۳۱۲، ۳۲۶،۳۷۳، ۴۱۹۔۴۲۰،۴۲۲، ۴۷۰،۴۷۱،۳/۵۱، ۱۰۹، ۲۱۱،۲۱۴، ۲۱۷۔ ۲۱۸،۲۶۳،۲۶۴، ۴/۷۸۔۸۱،۳۰۶،۳۱۹،۳۵۲۔ ۴۹۔ اشرف التفاسیر۱/۲۹۱
۵۰۔ البقرۃ۲:۱۸۷
۵۱۔ دیکھیے اشرف التفاسیر۱/۱۶۶۔۱۶۷
۵۲۔ المائدۃ۵:۱۱۴
۵۳۔ اشرف التفاسیر۲/۲۸۹
۵۴۔ الحدید۵۷:۲۵
۵۵۔ دیکھیے اشرف التفاسیر۴/۲۱۲
۵۶۔ الحج۲۲:۴۷
۵۷۔ المعارج۷۰:۴
۵۸۔ اشرف التفاسیر۳/۸۰۔۸۱
۵۹۔ الاعراف۷:۵۶
۶۰۔ اشرف التفاسیر۲/۱۷۴
۶۱۔ ایضاً۲/۱۷۵
۶۲۔ ایضاً ۱/۱۷۱
۶۳۔ ایضاً۲/۸۵
۶۴۔ ایضاً ۲/۴۱۰

☆ ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ (الکھف ۱۸:۸۶)''اسے ایسا پایا کہ وہ (آفتاب) کیچڑ کی ندی میں غروب ہورہا ہے۔''

۶۵۔ اشرف التفاسیر۴/۳۴۵
۶۶۔ قٓ۱۰:۱۶

☆ ایضاً۔ یہ آیت کا سباق ہے۔

۶۷۔ ایضاً۴/۶۸
۶۸۔ ایضاً۱/۳۳۔۳۴